المنار

بسم الله الرحمن الرحيم

ارشاد نبوی

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم والذی نفسی بیده لایومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه -
(بخاری)

(ترجمہ) انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے تھے .. کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص سچا مومن نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہیں کرتا جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

جلد (۳) شمارہ (۴)

تعلیم الاسلام کالج لاہور

مدیر اعلیٰ
شیخ محبوب عالم خالد
بی اے (آنرز) ایم اے

مدیران
بشیر احمد رفیق
عبداللطیف

فروری ۱۹۵۳ء

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ	م-ع-خ	۲
حدیث	صاحبزادہ مرزا بشیر احمد ایم اے	۴
قائد اعظم کا ارشاد		۵
اسلام کا نظریۂ مساوات	رفیق احمد ثاقب	۶
تابوت کا دانہ	سمیع اللہ قریشی	۸
کروچے کا نظریۂ فن	عبداللطیف	۹
میں ایک طالب علم ہوں	محمد بشارت اللہ	۱۱
طلبہ سے خطاب	قائد اعظمؒ	۱۲
ایک مشاعرہ	کرامت اللہ	۱۳
غزل	قاصد طریف	۱۵
کوہ مری	محمد ذکریا طاہر	۱۵
مرزا غالب کے کلام میں شوخی و ظرافت	کرامت اللہ	۱۶

(پبلشر جنید ہاشمی نے دستکاری پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا)

م - ع - خ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادار یہ

المنار کا مسلک بیان کرتے ہوئے ہم فروری مارچ ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں لکھا تھا :-

"ملک کے اطراف و جوانب سے سیاسی، ادبی، علمی اور تفریحی ہر نوع کے رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا مطمح نظر مخصوص سیاسی نظریوں کی اشاعت و ترویج ہے۔ بعض کا مقصود علم و ادب کی خدمت اور بعض محض تفریح طبع کی غرض سے شائع ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے جو ماہنامے منسوب ہیں ان میں سے بھی بعض علمی و ادبی اور بعض محض تفریحی ہیں۔ **المنار** کو ان میں سے کونسا مسلک اختیار کرنا چاہیے، ادارۂ **المنار** کے لئے یہ ایک اہم سوال تھا۔ اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسے ہر پہلو پر غور کرنا تھا۔ طبعیات اور کیمیا۔ ریاضی اور اقتصادیات۔ فلسفہ اور تاریخ وغیرہ مضامین پر گھنٹوں دماغ سوزی کے بعد تھکے ماندے جسموں اور پژمردہ ذہنوں کے لئے چند لمحوں کی تفریح **المنار** اپنا منتہا قرار دے یا اس سے بلند تر مقصد ـــــ سنجیدہ منظری اور سنجیدہ نگاری جو قارئین **المنار** کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا دے اور انھیں بروئے کار لائے۔ مقدم الذکر مقصد میں ہمیں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی۔ اس لئے کہ اس کی افادیت آنی و وقتی ہے۔ اس لئے ہم نے مؤخر الذکر مسلک اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک تعلیمی ادارے سے منسوب ہونے والا ماہنامہ ہمارے نزدیک معیاری ہونا چاہیے۔ جو سنجیدہ نگاری کا مرقع اور علمی تحقیق و تجسس کا حامل ہو۔ اس لحاظ سے اسے تجارتی رسائل سے ممیز ہونا چاہیے۔ پھر اس ماہنامہ کے لئے جو تعلیم الاسلام کالج سے منسوب ہو۔ اس کے علاوہ بعض اور امتیازات کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

تعلیم الاسلام کالج ایک اہم مقصد کے لئے معرض وجود میں آیا ہے ـــــ جدید علوم کی ترویج و تعلیم ـــــ اسلامی نظریات کے پس منظر میں ـــــ مقصد عالی اور منزل کٹھن ہے جو سعی پیہم اور جہد مسلسل کی مقتضی ہے اس لئے ضروری ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کا ماہنامہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھے اور معیاری ہونے کے علاوہ جدید علوم اور اسلامی نظریات کا آئینہ دار ہو۔"

عشق و محبت کے افسانوں کی خوگر طبائع پر یہ امر ابتداءً ناگوار گزرا بعض حلقوں سے اس پر صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی۔ مگر **المنار** اپنے مسلک سے سرِمو انحراف پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف دھیرے دھیرے بڑھتا چلا گیا۔

المنار جلد ۳ کی گزشتہ اشاعتوں میں جہاں ایک طرف "خدا تعالےٰ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے" ـــ "جذبۂ عشق حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر فدائیوں اور ان کے ہمنواؤں کے اعتراضات کی حقیقت" ـــ "مسلمان عورت کا انداز گفتگو اور لباس" ـــ "تاریخ اسلام کے متعلق بعض اصولی نظریے" اور "مکتوبات نبوی صلعم پر ایک نظر" ـــ وغیرہ مذہبی مضامین شائع ہوئے۔ وہاں دوسری طرف "اردو کی ابتدا کا مسئلہ" "شیکسپیئر ـــ جولیس سیزر میں" ـــ "بچوں کی نفسیات" ـــ "عرب ـــ اسلام سے قبل" ـــ "حالی کی تنقید نگاری" ـــ "اردو تنقید پر ایک نظر" ـــ "شیلے اور اس کی شاعری" ـــ "ترقی پسند شاعری" اور "اصول تنقید" وغیرہ علمی مضامین بھی شائع ہوئے۔ **المنار** کے زیر نظر شمارہ کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ اب طلبہ کا سنجیدہ طبقہ سنجیدہ نگاری کی طرف بسرعت راغب ہے ـــ چنانچہ یہ شمارہ اکثر و بیشتر طلبہ ہی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اسلام کا نظریۂ مساوات

"کروچے کا نظریۂ فن" — "غالب کی شوخی و ظرافت" انہی کی کاوشِ ذہنی کے خوش کن نتائج ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اگر طلبۂ المنار نے اسی دلبستگی کا ثبوت دیتے رہے تو انشاء اللہ العزیز یہ صحیح معنیٰ میں "سنجیدہ نگاری کا مرقع" اور "علمی تحقیق و تجسس کا حامل" ثابت ہوگا۔

● ● ● ● ●

المنار کے شمارہ مئی جون ۱۹۵۲ء میں مزاح کے زیرِ عنوان ہم نے لکھا تھا:

"مزاح کشمکشِ حیات کی گوناگوں صعوبتوں کے احساس کو کم سے کم ایک حد تک محو کر دیتا اور اسی طرح ان تلخیوں کو ہمارے لیے قابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوش طبعی فرما لیا کرتے تھے ....

المنار میں ایک حد تک مزاحیہ مضامین کی بھی گنجائش ہے۔ بشرطیکہ مزاح بے ضرر ہو جس سے کسی کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ نیز حقیقت پر مبنی ہو کہ جھوٹ بہر صورت ناپسندیدہ امر ہے، خواہ اس سے مقصد خوش طبعی ہی ہو۔ المنار اپنے تئیں جھوٹ کی اشاعت کے لیے تیار نہیں پاتا۔"

المنار کے زیرِ نظر شمارہ میں "میں ایک طالب علم ہوں"۔ اور "ایک مشاعرہ" ایسی مزاحیہ تخلیقات بھی شامل ہیں۔ جن میں مندرجہ بالا امور کے علاوہ افادیت کا پہلو بھی ملحوظ ہے۔ "میں ایک طالب علم ہوں" میں طنزیہ انداز میں کالجوں کے طلبہ کی روزمرہ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور "ایک مشاعرہ" میں رائج الوقت مشاعروں پر مزاحیہ انداز میں تنقید۔

● ● ● ● ●

اشاعتِ آئندہ سے جلد نمبر ۴ کا آغاز ہوگا۔ انشاء اللہ۔ جلد سوم کی تکمیل عبد اللطیف۔ بشیر احمد رفیق۔ جنید ہاشمی۔ رفیق احمد ثاقب۔ احمد بشارت اللہ۔ سمیع اللہ قریشی۔ سعد درانی۔ پروفیسر بشارت الرحمٰن۔ پروفیسر عبد العزیز اور مولانا غلام احمد کی مرہونِ منت ہے۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

● ● ● ● ●

ہمیں مسرت ہے کہ علمی طبقہ المنار کی سنجیدہ نگاری کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ چنانچہ ہمیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی سینئر لیکچرار شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی کا اس سلسلہ میں ایک مکتوب موصول ہوا ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے:

"بعض مضامین نہایت مفید اور دلچسپ ہیں ...... بحیثیتِ مجموعی رسالہ ایک کالج کے طالب علموں کا اچھا رسالہ ہے۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"نظموں کا حصہ کچھ ہلکا ہے۔"

اس سے ہمیں بکلّی اتفاق ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ اگر طلبہ و اساتذہ اس خامی کو دور کرنے میں بھی ادارۂ المنار سے تعاون فرمائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ المنار میں یہ خامی باقی رہے۔

● ● ● ● ●

بقیہ "میرزا غالب" صفحہ ۱۶ سے آگے۔

بقیہ "میرزا غالب" صفحہ ۱۶ سے آگے۔

مزید برآں ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اس شوخی اور ظرافت کے طرزِ بیان نے آپکے کلام پہ "سونے پر سہاگہ" کا کام کیا اسی طرح وہ چاند پر بھی چوٹ کرنے سے باز نہیں رہے ؎

شاید کہ مر گیا ترا رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

گو ظرافت اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال جیسے شاعروں کی بھی مرہونِ منت ہے۔ مگر مندرجہ ذیل شعر تو بالکل میرزا کی شاعری ہی پر چسپاں ہوتا ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

صاحبزادہ مرزا بشیر احمد
ایم اے

حدیث

حدیث ایک عربی لفظ ہے۔ جس کے بنیادی معنی ایسی نئی بات کے ہیں۔ جو یا تو بالکل ہی نئی ہو یا نئے انداز میں پیش کی گئی ہو۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی نئے اور بیش بہا حقائق پر مشتمل ہے اس لئے اس کا نام اصطلاحاً **حدیث** رکھا گیا ہے۔ پس حدیث اس مقدس کلام کا نام ہے جو ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ نفسی) کی زبان مبارک سے نکلا جس میں آپ کی پاکیزہ زندگی کا عملی چشم دید واقعہ بیان کیا گیا۔ اور پھر آپ کے صحابہ اور بعدہٗ مسلمان راویوں کے ذریعہ وہ کچھ عرصہ کے بعد تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا گیا۔ عربوں کا حافظہ جیسا کہ عیسائی مؤرخوں تک نے برملا تسلیم کیا ہے۔ غیر معمولی طور پر عمدہ تھا۔ اور جو بات بھی وہ سنتے۔ یاد رکھتے تھے۔ اسے بڑی حفاظت کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اور چونکہ حدیث ایک مقدس دینی علم ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ بڑی احتیاط اور بڑی امانت اور بڑی دیانت سے کام لیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو غیر معمولی حفاظت کے ساتھ پیچھے آنے والی نسلوں تک پہنچایا گیا۔ بیشک بعض راوی حافظہ اور سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے ایسے پکے نہیں تھے کہ ان کی روایتوں پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔ مگر حدیث جمع کرنے والے بزرگوں نے ایسے پختہ اصول مقرر کر دیئے ہیں کہ ان کے ذریعہ مناسب چھان بین کے ساتھ صحیح حدیثوں کو کمزور حدیثوں سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث بیان کرنے کا طریق

حدیث بیان کرنے کا طریق عموماً یہ ہوتا تھا کہ جس صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی بات سنی ہوتی تھی۔ یا آپ کو کوئی کام کرتے دیکھا ہوتا تھا۔ تو وہ اسے اشاعت علم کی غرض سے ایسے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ جنہوں نے یہ بات نہیں سنی۔ یا نہیں دیکھی تھی۔ یا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں پایا ہوتا تھا۔ اور حدیث بیان کرنے کے الفاظ عموماً اس قسم کے ہوتے تھے۔ کہ میں نے فلاں شخص سے یہ بات سنی ہے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فلاں بات سنا۔ کہ اس نے فلاں موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ یا یہ کام کرتے ہوئے دیکھا کہ .... اور پھر یہ لوگ اسی طریق پر ایمان تازہ کرنے کی غرض سے یا اشاعت علم کی غرض سے دوسرے لوگوں تک روایت پہنچاتے چلے جاتے تھے۔ اور اس طرح راویوں کے مسلسل اور باقاعدہ سلسلہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بعد میں آنے والوں کے ذریعہ محفوظ ہو گئیں۔

راویوں کے طبقات

حدیث کے راوی کئی طبقات میں منقسم ہیں۔ سب سے اوپر کا مسلمان راوی جس نے کوئی بات براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سنی ہو۔ یا آپ کو کوئی کام کرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ **صحابی** کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے کا راوی جو صحابی سے سن کر آگے روایت کرتا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں **تابعی** کہلاتا ہے اور اس سے نیچے کا راوی **تبع تابعی** کہلاتا ہے۔ اور اس کے بعد عام راویوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حافظہ اور سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے بھی راویوں کے مختلف طبقات سمجھے جاتے ہیں۔

حدیث کی مشہور کتابیں

حدیث کی روائتیں عموماً دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر تیسری صدی ہجری کے آخر تک جمع ہوکر کتابی صورتوں میں مرتب کرلی گئی تھیں۔ حدیث کی کتابیں یوں تو بہت ہیں۔ مگر ان میں سے چھ کتابیں خاص طور پر زیادہ صحیح اور زیادہ مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے ان چھ کتابوں کا نام **صحاح ستہ** (یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں) مشہور ہوگیا۔ ان چھ کتابوں کے نام یہ ہیں :

(۱) **صحیح بخاری** : مرتبہ امام محمد بن اسماعیل البخاری (ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ) امام بخاری کی یہ کتاب حدیث کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے۔ اور امام بخاری کا ذاتی مقام بھی مسلمہ طور پر سب محدثین میں بالا سمجھا گیا ہے۔ اسی لئے صحیح بخاری کا نام اَصَحُّ الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب) مشہور ہوگیا ہے۔

(۲) **صحیح مسلم** : مرتبہ امام مسلم بن الحجاج النیشاپوری (ولادت ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ) ان کی کتاب صحاح ستہ میں دوسرے نمبر پر شمار ہوتی ہے۔ اور نہایت عمدہ اور قابلِ اعتماد مجموعہ سمجھی گئی ہے اکثر محدثین صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو ملا کر صحیحین (یعنی حدیث کی دو صحیح ترین کتابیں) کا نام دیتے ہیں۔

(۳) **جامع ترمذی** : مرتبہ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ) یہ امام بخاری کے شاگرد تھے۔ ان کا مجموعہ احادیث بھی نہایت اعلیٰ مقام پر مانا گیا ہے۔

(۴) **سنن ابوداؤد** : مرتبہ امام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ) فقہی مسائل کی تدوین میں انہیں بہت ارفع مقام حاصل ہے۔ مگر اس بارے میں محققین میں اختلاف ہے کہ جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں سے کس کا مقام زیادہ بلند ہے۔

(۵) **سنن النسائی** : مرتبہ امام بن شعیب النسائی (ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۶ھ) امام نسائی بھی حدیث کے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔ اور ان کی کتاب کا درجہ صحاح ستہ میں عموماً پانچویں نمبر پر مانا گیا ہے۔

(۶) **سنن ابن ماجہ** : مرتبہ امام محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ) یہ کتاب صحاح ستہ میں چھٹے یعنی آخری نمبر پر سمجھی جاتی ہے۔ سنن ابن ماجہ بھی حقیقتاً ایک عمدہ کتاب ہے۔

ان جملہ محدثین نے صحیح حدیثوں کی تلاش اور چھان بین میں اپنی عمریں خرچ کرکے لاکھوں حدیثوں کے ذخیرہ میں سے اپنے مجموعوں کا انتخاب تیار کیا ہے۔ لاریب تمام عالم اسلامی کو ان بزرگوں کا دلی شکر گزار ہونا چاہیئے۔

وجزاھم اللہ احسن الجزاء

اوپر کی چھ مشہور کتابوں کے علاوہ حدیث کی مندرجہ ذیل دو کتابیں بھی بہت مشہور ہیں۔

۱۔ **موطا** : مرتبہ امام مالک ابن انس المدنی۔

۲۔ **مسند** امام احمد بن حنبل البغدادی

(باقی باقی)

(ماخوذ از "چالیس جواہر پارے")

قائدِ اعظم کا ارشاد

"اگر آپ لوگ باہمی تعاون سے کام کریں۔ ماضی کو بھول جائیں۔ اور گذشتہ راصلوات پر عمل کریں۔ تو یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اگر آپ مل جل کر اس جذبہ کے تحت کام کریں کہ ہر شخص خواہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو ماضی میں آپ کے تعلقات ایک دوسرے سے خواہ کیسے ہی رہے ہوں اس کا رنگ نسل۔ مذہب کچھ ہی ہو۔ اولاً۔ ثانیاً۔ آخراً اسی مملکت کا شہری ہے اس کے حقوق مراعات اور ذمہ داریاں مساوی اور یکساں ہیں تو ہم بے حد ترقی کریں گے۔ ہمیں اس جذبہ کے تحت کام شروع کردینا چاہیئے۔ پھر رفتہ رفتہ اکثریت اور اقلیت کے مسلمان فرقہ اور ہندو فرقہ کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔"

(مجلس دستور ساز پاکستان)

رفیق احمد ثاقب

اسلام کا نظریۂ مساوات

مساوات کے متعلق کسی نظریہ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :
اوّل عام انسانی حقوق میں مساوات اور دوم اقتصادی طور پر مساوات۔

اقتصادی مساوات کی تشریح عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو یکساں پیدا کیا ہے۔ لہٰذا دولت کی تقسیم کے لحاظ سے بھی وہ سب یکساں ہونے چاہئیں۔ اور ہر شخص کو برابر کا حصہ ملنا چاہیئے تاکہ وہ برابر کا فائدہ اٹھا سکیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ خیال ہی نہایت بھونڈی قسم کا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے اُس وقت کا جبکہ مالی لحاظ سے تمام بنی نوع انسان یکساں ہوں گے کیا ایسی صورت میں دنیا کا کاروبار ایک لحظہ کے لیئے بھی چل سکے گا ؟ کوئی شخص دوسرے سے تعاون کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی درجہ کے ہوں گے۔ نہ کوئی کام لینے والا رہے گا اور نہ کوئی کام کرنے والا۔ سب ایک ہی درجہ کے ہوں گے۔ ایسی صورت میں کون کسی کے ماتحت رہنا پسند کرتا ہے اس دنیا کا نظام تو اس قسم کی مساوات کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی چل رہا ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ اعلیٰ قابلیتوں کے مالک ہیں۔ کچھ درمیانے درجہ کے اور کچھ ادنیٰ درجہ کے۔ ادنیٰ اور درمیانہ درجہ کے لوگ اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں۔ اس کے بغیر دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اعلیٰ ذہنی اور دماغی قابلیتوں کے مالک جن کی اقتصادی حالت ان صلاحیتوں کی وجہ سے بہتر ہوتی ہے ان لوگوں کی امداد کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ جو ان صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ اور ادنیٰ صلاحیتوں کے مالک اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کی رہنمائی کے بغیر کامیاب زندگی نہیں گزار سکتے۔ دونوں کی موت و حیات کا دارومدار ایک دوسرے پر ہے ایسی حالت میں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تمام انسانوں کی مالی حالت ایک جیسی ہو۔ اور پھر ان میں سے ایک وزیر ہو تو دوسرا بھنگی کا کام کرتا ہو یا ایک انجینئر ہو اور ایک اس جیسا ہی اس کا بھائی مزدور۔ پس اگر ہم غور کریں۔ تو ہمیں یہ معلوم ہوگا۔ کہ اقتصادی مساوات کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام انسانوں میں دولت کی تقسیم برابر برابر ہونی چاہیئے۔ یہ اصول عقل اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ ہاں ہر انسان کا بطور ایک انسان کے یہ حق ضرور ہے کہ اسے کھانے کے لئے روٹی، پہننے کے لیئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان میسّر ہو۔ اسی طرح کسی انسان کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ وہ بے انتہا دولت کا مالک بن جائے۔ اور اس میں سے وہ غرباء کا مناسب حصہ نہ نکالے وہ خود تو سیر ہو کر کھانا کھائے اور اچھے سے اچھا کپڑا پہنے۔ مگر اس کا غریب ہمسایہ بھوکا اور ننگا رہے پس ایسی ہی حالت کو ہم اقتصادی مساوات کا نام دے سکتے ہیں۔ اور اسلام نے بھی ایسی ہی مساوات کو قائم کیا ہے جس میں فارغ البال اصحاب اپنے مال کو زکوٰۃ اور صدقہ کے ذریعہ غریبوں میں تقسیم کریں۔ تاکہ وہ بھی اپنی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ اس طرح امیروں کی دولت سے غریب بھی بہرہ ور ہوتے رہیں گے۔

مساوات کی دوسری اور زیادہ اہم قسم ہے **نسلی اور شخصی حقوق کی مساوات**۔

دراصل غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی مساوات میں سب سے مقدم سوال دولت کی تقسیم کا نہیں ہے بلکہ انسان کی نسلی اور شخصی مساوات کا ہے کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس میں مختلف انسانوں میں آپس کی جذباتی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سوسائٹی کے مختلف طبقات میں نفرت و حقارت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں مختلف انسانی طبقات

ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں اسلام نے انسانی حقوق کے متعلق کس قسم کی مساوات قائم کی ہے؟ اس کے متعلق بانی اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سادہ مگر فیصلہ کن الفاظ میں یوں فرماتے ہیں :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ۔ أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى۔

(مسند امام احمد بن حنبل)

یعنی "اے لوگو سن لو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک۔ سن لو کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں اور عجمیوں کو عربوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور اسی طرح گوروں کو کالوں پر کسی قسم کا تفوق حاصل نہیں۔ اور نہ ہی کالوں کو گوروں پر کوئی فضیلت حاصل ہے سوائے تقویٰ کے کہ اس میدان میں ہر شخص اپنی کوشش سے آگے نکل سکتا ہے۔"

پس یہ نظریہ اسلامی مساوات کا بنیادی پتھر ہے۔ جس کے ماتحت دنیا بھر کی اقوام اور تمام لوگوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی اجازت دی ہے کہ ہر شخص اپنی محنت کے زور سے دوڑ میں آگے نکل سکتا ہے۔ یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے تاکہ لوگوں میں جدوجہد اور کوشش کرنے کا مادہ بھی قائم رہے اور وہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی بھی کوشش کریں۔ قدرت نے انھیں جو طاقتیں ودیعت کی ہیں اور جو ذرائع بخشے ہیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ترقی کے وسیع میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے پورا زور لگائیں۔ تاکہ دنیا کی ترقی کبھی رک نہ جائے جس کا نتیجہ تمام دنیا کی تباہی ہے پس اگر مکمل مساوات قائم کر دی جائے۔ اور مسابقت کی روح پیدا نہ کی جائے۔ تو دنیا کی ہر قسم کی ترقی فوراً رک جائے گی اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کیونکہ یہ امر واقع ہے کہ جب تک دو اشخاص میں مقابلہ کی روح پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر دونوں اپنی پہلی حالت پر ہی صبر و شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ تو بالآخر دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ پس دنیا کا نظام چلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو برابر کا حق حاصل ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ترقی کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی بھی کھلی اجازت ہو۔ مساوات کا یہی نظریہ اسلام پیش کرتا ہے۔

مساوی انسانی حقوق کے بارے میں سب سے بڑا مسئلہ غلاموں کے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ ہزارہا سال سے چلا آ رہا ہے اور ایک لحاظ سے عملاً آج بھی ہے صرف اتنا فرق ہے۔ کہ انفرادی غلامی کی بجائے اجتماعی یا قومی غلامی کا دَور دَورہ ہے جو پہلی قسم سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ عدم مساوات کا سب سے بُرا نمونہ غلاموں کی صورت میں ہی نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق ایک شخص کو دوسرے شخص یعنی اپنے غلام پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور ان دونوں کے حقوق میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے غلامی کا بکلّی انسداد کر دیا ہے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں رکھا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو امن کی حالت میں غلام بنا لے۔ غلامی کے متعلق اسلامی نظریہ خود ایک وسیع مضمون ہے جسے میں آئندہ کبھی علیحدہ طور پر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ پس جہاں تک انسانی حقوق کا سوال ہے اسلام نے اس میں پوری پوری مساوات قائم کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو برابر کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ باقی رہی اقتصادی مساوات۔ سو اس کے متعلق عرض ہے کہ ایسی مساوات کو اوّل تو عقل ہی تسلیم نہیں کرتی اور یہ قائم ہو سکتی ہی نہیں۔ دوسرے بالفرض اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے۔ کہ ایسی مساوات کا قیام ممکن ہے تو اس صورت میں بھی جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہمارا ہر قسم کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ تمام سلسلہ ہی درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے۔ پس پوری اقتصادی مساوات تو قائم ہو ہی نہیں سکتی صرف روپیہ ہی تو انسان کی خوشی کا باعث نہیں ہوتا۔ اور نہ صرف روٹی ہی اس کا پیٹ بھرتی ہے اس کے علاوہ کیا ہر شخص ایک سی روٹی کھا کر ایک جیسا مزہ حاصل کر سکتا ہے؟ کیا ہر شخص کی نظر ایک سی ہے؟ کیا ہر شخص کی صحت ایک سی ہے؟ پس کیا ان امور میں مساوات قائم کی جا سکتی ہے؟

غرض مساوی دولت تقسیم کر کے بھی حقیقی مساوات قائم نہیں ہو سکتی دل کا چین اور حقیقی راحت دولت نہیں دے سکتی۔ یہ تو کسی شخص کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور مذہب اور خدا تعالیٰ سے تعلق کے بغیر ہرگز

حاصل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ امور اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ بے شک لوگوں میں روٹی برابر تقسیم کر دی جائے۔ بے شک کپڑا بھی یکساں دیدیا جائے لیکن انسان کو حقیقی چین اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا۔ جب تک اس کا خدا سے تعلق نہ ہو۔ کیونکہ روٹی کپڑے کے علاوہ ہزاروں امور ایسے ہیں جن کی کمی بیشی سے انسان کے دل کا چین اور سکون زائل ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ روس میں ایسا نظام قائم ہے جس میں دولت کی برابر طور پر تقسیم کی جاتی ہے۔ حالانکہ واقعات اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں کیا روس کے ہر شخص کو ویسا ہی آرام حاصل ہے جیسا کہ سٹالین یا دوسرے وزرا کو حاصل ہے؟ کیا روس کے ایک عام مزدور کو روس کے وزیر اعظم جتنی تنخواہ ملتی ہے۔ یقیناً ایسا ہرگز نہیں ہے پس عقل مانتی ہے اور واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ اسلام کا پیش کردہ نظام ہی مکمل اور قابل عمل ہے۔ اسلام اقتصادی لحاظ سے ایسا توازن چاہتا ہے کہ دولت رعایا کا ایک حصہ بھوکا ننگا رہے اور بالکل قلاش ہو اور دوسرا حصہ بے حد دولت کا مالک ہو۔ اور نہ ہی ایسا نظام پیش کرتا ہے کہ تمام انسان برابر برابر دولت کے مالک ہوں۔

اسلام کا پیش کردہ مساوات کا اصول اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے بین بین ہے اور یقیناً صحیح اور قابل عمل اور کامیاب اصول ہے اسلام انفرادی ترقی کی روح کو بھی نہیں روکتا۔ اور فرد واحد کے ہاتھوں میں ہی ساری دولت سمٹ جانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ ایسا انتظام کرتا ہے۔ کہ افراد اپنی کوشش سے خوب دولت کما سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ انتظام بھی کیا ہے۔ کہ یہ دولت ان کے پاس ہی ہمیشہ کیلئے جمع ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ مختلف ذرائع سے یہ دولت واپس لے لی جاتی ہے۔ اور اسے غریب اور محتاج لوگوں پہ صرف کیا جاتا ہے اسلام ایک شخص کو یہ تو اجازت دیتا ہے۔ کہ وہ جتنا چاہے کما لے۔ لیکن اسے یہ بھی حکم ہے۔ کہ وہ اس وقت تک اپنا کھانا نہ کھائے جب تک وہ یہ تسلی نہ کر لے کہ اس کے پڑوس میں کوئی غریب شخص بھوکا نہیں رہ گیا پس اسلام کا شاندار نظریۂ مساوات تمام بنی نوع انسان کے مابین ایک ایسا توازن قائم کر دیتا ہے کہ اگر دنیا اسے اپنا لے تو وہ یقیناً اپنے مسائل کو بخوبی حل کر سکتی ہے۔

سمیع اللہ قریشی

تابوت کا راز

دور گھنیری چھاؤں میں
دور گھنے سایوں کے تلے
اک پربت کے پاؤں میں
کہتے ہیں کچھ پھول کھلے،
پھول کھلے کملا بھی گئے
آخر اتنی جلدی کیوں؟
رقص کیا مرجھا بھی گئے
یہ بھی ٹھہرا ایک فسوں!

تاریکی کی چھاؤں میں
رکھا ہے تابوت جہاں
موت کے اجڑے گاؤں میں
آ کر ٹھہرے پھول کہاں
یہ تاریکی یہ تابوت
یہ تابوت اور مردہ پھول
کافی ہے یا اور ثبوت؟
دیکھ لو ان پر اڑتی دھول

اس دنیا کے در بانو!
کیا کر دوں اس راز کو فاش؟
اس تابوت میں انسانو!
انسانیت کی ہے لاش

عبداللطیف

کروچے کا نظریۂ فن

کروچے کے نزدیک علم ہمیشہ دو طرح کا ہوتا ہے وجدانی اور منطقی یا انفرادی اور آفاقی علم جو ہمیں تخیل کی مدد سے حاصل ہوتا ہے یا وہ علم جو ہم عقل کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔ علم جو حسیاتی ارتسامات کی پیداوار ہے یا تصورات کی صورت میں نمو پذیر ہوتا ہے۔

اپنی روزمرہ زندگی میں (یہ روزمرہ زندگی کروچے کے نزدیک فطری زندگی ہے) ہم چیزوں کو وجدانی کیفیات کی مدد سے سمجھتے ہیں مگر عملی زندگی میں ہم استدلال سے کام لیتے ہیں۔ فن ہمارا وجدانی علم ہے اور فلسفہ یا سائنس استدلالی ـــ وجدان چیزوں کا صحیح یا بلا واسطہ علم ہے مگر تصورات اس کی درمیانی کڑیاں کہلاتے ہیں۔ اور ان کا درمیانی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اس ایک پھول کا علم مجھے وجدان کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ اور اس کا تصور ایسے لاتعداد پھولوں کی درمیانی کڑیاں ملانے سے۔ اسی طرح سائنس کی دنیا حقائق کی دنیا ہے۔ سائنس دان چیزوں کی ہیئت نظام ان کے صفات و عناصر اور ان کی خصوصیات و تعلقات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ اشیا کی منظم و مدلل تشریح ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی فطرت ماہیت اور تاریخ کو بھی شامل کرتا ہے۔ مگر فن کار کا کام ان سے محض اثرات لینا ہے اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ اثرات لے سکے۔ اور مختلف اثرات کو منظم کر کے اپنے جذبات و محسوسات کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔ فن جذبات سے پیدا ہوتا اور جذبات ہی میں گردش کرتا ہے۔ یہ ہمیں چیزوں کا علم جذبی اور روحانی پہلوؤں سے دلاتا ہے۔ اس لیے یہ بیک وقت سائنس کے مد مقابل اور اس کی تکمیل کے لیے بھی ممد ثابت ہوتا ہے۔

فن زمان و مکاں کی قید سے بالاتر ہے۔ مثلاً افسانہ سنتے وقت ہر وقت اور لمحے تصورات کو ہمیشہ بھول جایا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری تمام منطقی اور ارادی قوتیں نہ ہماری دو دھری آہیں وغیرہ زمان و مکاں کی قیود میں ہرگز نہیں لائی جا سکتیں۔ مگر عقل کی رہنمائی فن کے لیے ضروری ہے۔ ممکن ہے کسی پر سوز نغمے کی دلگداز سُروں یا چاندنی کے کسی حسین منظر کی نقاشی کے لیے ہمارے عقل کی رہنمائی ضروری نہ ہو مگر ان کے منظم کے لیے فن کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

ہماری حسیات کے ساتھ بھی فن کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ حسیت دراصل بے رنگ ، وہ ہے یہ ہماری بے ارادہ اور میکانکی حرکت ہے زندگی میں کتنے لمحات ایسے آتے ہیں جب ہم اپنے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؟ مگر ہم صرف ان کی ایک ہی جھلک کو فن نہیں قرار دے سکتے۔ جس کا تعلق مواد سے ہے اور مواد و ہیئت اگر متضاد نہیں تو ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں۔ مواد ایک خارجی عمل ہے جو ہمیں بتلایا جاتا ہے مگر ہیئت ہمارا وہ اندرونی اور شعوری عمل ہے جو خود کو خارجی حقائق کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔ ہیئت کے اندر استقلال ہے اور یہ ایک روحانی عمل ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مواد ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اپنے اظہار کے لیے ہیئت مواد کی دست نگر ہے جو اس کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

میرے خیال میں کروچے کا یہ ہیئت و مواد کا نظریہ افلاطون کے نظریہ علم سے ماخوذ ہے نیز کروچے کے اس نظریے کے ڈانڈے مارکسزم سے جا ملتے ہیں کیونکہ ہیئت اگر اپنے اظہار کے لیے مواد کی محتاج ہے اور مواد ہر وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ تو پھر ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے جمالیاتی تقاضے بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کروچے کی حمایت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہیئت کو مواد کے انتخاب کا حق حاصل ہو۔ جو سراسر ایک ارادی عمل ہے۔ اور یہ کروچے کے نظریے کے بالکل متضاد۔

اسی طرح کروچے کے نزدیک تلازمات ذہنی کا بھی ہمارے فن

کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اگر تلازمات سے مراد پچھلی حسیات یا ارتسامات کی یاد لی جائے تو یہ پھر ایک خارجی عمل ہے اور اگر اس سے مراد حافظہ ہے۔ تو یہ پھر ہماری تخلیقی قوتوں کا جزو بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر وجدان اظہار چاہتا ہے اور جو وجدان اظہار کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا ایک انفعالی عمل یا ہماری حس ہے۔ ہماری ہر ہیئت اظہار (بیان) کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس کا الفاظ۔ تصاویر یا گیتوں کی شکل میں نمودار ہونا کوئی ضروری بات نہیں الفاظ وغیرہ سے پہلے بھی وجدان کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے۔ الفاظ تو اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ یعنی ہیئت خارجی حقائق سے متاثر ہو کر پھر اس سے بے نیاز ہو جاتی ہے مگر میرے خیال میں فنکار جب اپنے گہرے وجدان کے لئے مواد کا محتاج ہوتا ہے تو اپنے وجدان کی تکمیل، استحکام یا بقا کے لئے بھی اسے خارجی حقائق کی ضرورت محسوس ہونی چاہیئے۔ اور اسی لئے اظہار کا الفاظ۔ تصاویر یا رنگوں کی صورت میں نمودار ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہمارے وجدان کے بکھرے ہوئے بے ترتیب اجزا میں تنظیم و ترتیب ناممکن ہے۔

کروچے فنی دنیا میں کسی منطقی حقیقت کا متلاشی نہیں تھا۔ فن میں واضح وجدان کی ضرورت ہے خواہ وہ منطقی لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح حسیاتی ارتسامات کے بغیر وجدان اور وجدان کے بغیر اظہار ناممکن ہے۔ اسی طرح اظہار کے بغیر منطق بھی ناممکن ہے۔ مگر اظہار کسی منطق کا محتاج نہیں گویا اظہار ہمارا ابتدائی علم ہے۔

کروچے پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہر قسم کے مواد کو ہیئت کے قابل سمجھا اور سب سے بڑے عنصر تنوع کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ فن جس طرح ہماری منطق کی ابتدا ہے۔ بالکل اسی طرح اس کی انتہا بھی ہے۔ ہمارے منطقی استدلال بھی ہمارے جذبات کی طرح تغیر پذیر ہیں۔ اور ہر وقت اپنا مقام تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ہر بڑا فلاسفر اور ہر بڑا سائنس دان اپنے نظریات کے لئے تخیل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور تخیل ہمارے فن کا بہت بڑا حصہ ہے اسی طرح بقول شیلے فنکار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی تنوع پسندی ہے۔ ہمارے وہ مسائل یا وہ تجربات جن کو ہماری روزمرہ یا عملی و عقلی زندگی اپنا سکتی ہے۔ وہ ہمارے فن کا مواد نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ کسی بدلی ہوئی صورت میں ہمارے سامنے نہ آئیں۔

اسی طرح فن کو افادی پہلوؤں سے بھی نجات نہیں مل سکتی۔ کیونکہ ہماری تنوع پسند وجدانی قوتیں ہر نئی دریافت پر پیچھے کی طرف لوٹتی ہیں تاکہ وہ گذشتہ یادوں کو بھی اپنے ساتھ ملا سکیں۔ لہٰذا فن میں بھی صحیح تنوع یا زندگی کے بنیادی مسائل سے گریز ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ شیلر پر تنقید کرتے ہوئے کروچے نے فن کو روحانی لذت کہا ہے حالانکہ خود اس کے نظریئے کے مطابق فن ہمارا فطری تقاضا ہے اور لذت اس کا نتیجہ۔

بہرحال جمالیاتی دنیا میں کروچے کا مقام بہت بلند ہے اس نے اپنے جمالیاتی نظریات میں تمام نقادوں کا جواب نہایت احسن طریق سے دیا ہے فن کو علم و عمل یا دیگر حیوانی تقاضوں سے نجات دلانے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے فن کار کی انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ جس کا ذکر ہم کبھی آئندہ کریں گے۔

"بقیہ ایک مشاعرہ"

صفحہ ۱۵ سے آگے :-

کی وجہ سے مشاعروں سے متنفر ہو چکا ہوں۔ ان اشتہاروں کو پڑھتے ہی وہی قبیح سا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور میں منہ پھیر کر نکل جاتا ہوں۔

کاش لوگوں کی ذہنیت اور مشاعروں کی یہ حالت بدلے۔ عوام شعراء کے جذبات سے کھیلنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں شاید حکومت سامعین کی تنقید کرنے والی زبانوں اور بے جا تالی پیٹنے والے ہاتھوں پر ٹیکس لگا دے۔ اور شعراء کرام اطمینان قلب سے لوگوں کو چیدہ چیدہ اشعار سے محظوظ کر سکیں۔ لگے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

احمد بشارت اللہ

میں ایک طالب علم ہوں

(طنز و مزاح)

جی ہاں۔ سوچنے کی کیا بات ہے اگر آپ کو اس میں کچھ شبہ ہو تو میرا اپنا شناختی کارڈ دکھا سکتا ہوں۔ جو میرے پرس میں ہے اس میں نہایت واضح الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ کہ "مسمی .... فلاں کالج میں تھرڈ ایئر کا طالب علم ہے"..... یعنی میں کالجیئٹ ہوں۔ اب تو یقین آ گیا ہوگا؟ ــــ نہیں؟ تعجب ہے۔ اوہو میں سمجھ گیا۔ آپ ــــ غالباً میرے شوخ و شنگ سوٹ اور میچنگ ٹائی سے دھوکا کھا گئے۔ اخاہ ــ آپ کا اندازہ بالکل غلط ہے یہ بالوں کو کرل کرنے کا شوق مجھے نیا نیا ہوا ہے۔ میں کسی فلم کا ہیرو نہیں ہوں۔ کبھی ہوسٹل میں کمرہ ۲۱۲ میں تشریف لایئے گا ــــ آپ کو میری ٹیبل پر ماڈرن بناؤ سنگھار کی کریمیں۔ پوڈرز۔ لکس۔ عطر..... غرضیکہ ہر وہ چیز جو ایک طالبعلم کی خوبصورتی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ نہایت قرینے سے رکھی ملے گی۔

آئیے نا۔ اجی "تکلف" کرنے کی کیا ضرورت ہے ذرا اپنے کمرہ کی سیر کرا دوں ــــ یہ رہی کپڑوں کی الماری۔ یہ ٹھہرے میرے کامٹی سوٹ اور ٹائیاں۔ آپ غالباً نہیں جانتے۔ میں ان چیزوں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ جب بھی منی آرڈر آتا ہے۔ میں اپنے لئے ایک نہ ایک سوٹ بنوا لیتا ہوں۔ یہ دیکھئے ٹو ٹیڈ کا سوٹ۔ اس کا کپڑا ۳۵ روپے گز کا ہے اور اسے مال روڈ سے سلایا گیا ہے۔ درزی نے پورے ساٹھ روپے لئے تھے ــــ ہاں پہن کر دیکھئے اور میچنگ کے لئے یہ ٹائی خریدی گئی ہے۔ دس روپے قیمت ہے اس کی۔ ان ٹائیوں کو بھی دیکھئے آپ ضرور میرے حسنِ انتخاب کی داد دیں گے۔ آپ کو اس جگہ ہر قسم کی ٹائیاں ملیں گی۔ یہ ہے میری تازہ ترین ٹائی۔ جو کل شاپنگ کے دوران میں ۱۵ روپے میں خریدی ہے۔ دیکھا کتنی شوخ اور چمکدار ہے۔ اس پہ یہ پھول ــــ اخاہ جب ٹو ٹیڈ کے سوٹ کے ساتھ اسے لگا کر باہر نکلا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس دنیا میں بس میں ہی میں ہوں۔ میں ٹائم کا بڑا پنکچوئل punctual ہوں۔ روزانہ جلیٹ gillete سے شیونگ کر کے کوئی آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد کوٹ پتلون۔ ٹائی اور شوز کے مختلف combinations کرتا ہوں۔ کبھی گیبرڈین کے سوٹ پر گرین ٹائی۔ براؤن شوز۔ کبھی ٹو ٹیڈ کے سوٹ پہ سرخ ٹائی اور سیاہ جوتا۔ آپ کہیں اس غلطی میں نہ رہیں۔ میرے پاس اور دو ایک سوٹ بھی ہیں ــــ غرض میں لباس کے معاملہ میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔ اپنے آپ کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوشش کرنا میری Hobby ہے۔ اچھا چلئے الماری کا معائنہ تو ہو چکا۔ اب آیئے میری کتابوں کی ٹیبل کی طرف۔ دیکھئے میں کتنا سلیقہ پسند طالب علم ہوں میرے پاس ہر چیز موجود ہے۔ میز پہ نہایت صاف ستھرا کپڑا بچھا ہے یہ تازہ ترین ناول ہے۔ کاپیاں۔ کتابیں .... اور دیگر ضروریات یہاں موجود ہیں ــــ آپ تو کاپی کو اٹھا کر دیکھنے لگے۔ خیر دیکھئے۔ غالباً تمام کاپیاں خالی نظر آئیں گی۔ کیونکہ میں انھیں بہت کم استعمال کرتا ہوں ممکن ہے بعض کے اوراق بھی کٹے ہوئے نہ ہوں۔ دراصل بات یہ ہے مجھے پڑھنے لکھنے کی فرصت ذرا کم ملتی ہے۔ آج اس فرینڈ کے ساتھ داک دیکھنے چلے گئے کل اس کے ساتھ سینما۔ پرسوں تیسرے کے ساتھ شاپنگ کرنے۔ بہرحال روزانہ کچھ ایسی ہی مصروفیات آ پڑتی ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے لئے ٹائم ہی نہیں ملتا۔

اونہہ۔ اجی۔ ہٹایئے ان خشک چیزوں کو۔ چلئے اب آپ کو اپنے کالج کی سیر کراؤں۔ مگر ذرا ایک منٹ ٹھہریئے۔ میں آئینہ دیکھ لوں

—— ٹھیک ہے ۔ اب غالباً انگریزی کا پیریڈ ہے ۔ دیکھیں کیب فرماتے ہیں پروفیسر صاحب ۔ پروفیسر صاحب آج بھی نہیں آئے ۔ اور اگر آ بھی جائیں تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ بس حاضری پوری کرنے کے لیے کلاس میں چلے جاتے ہیں "میرڈ پیپل Married People" شروع کیے پانچ دن ہو چلے ہیں ۔ کمبخت ختم ہونے میں نہیں آتی —— ارے سامنے دیکھیے ۔ رشید آ رہا ہے ذرا چال دیکھیے ۔ اس کا اپشنل فلسفہ لوجی ہے اور اب اس کا پیریڈ خالی ہے ۔ اب مجھے اپنے ساتھ ضرور ٹک شاپ لے چلے گا —— دیکھیے میرا اندازہ کتنا صحیح نکلا چلیے آپ بھی چائے پی لیں ۔ پھر آج سردی بھی تو زیادہ ہے —— حاضری ؟ حاضری کی آپ فکر نہ کریں ۔ کاردار میری PROXY بول دے گا اور غالباً ..... صاحب آج کلاس نہیں لیں گے جب شیخ صاحب سے مٹھ بھیڑ ہو گئی ہے تو کون جائے کلاس میں —— البتہ کوئی نیا سوٹ سلاؤں یا کوئی نئی ٹائی خریدوں تو کلاس اٹنڈ کروں گا ۔

اچھا آئیے ۔ پراچہ سے تازہ مسائل پر کچھ گفتگو ہو جائے ۔ کہیے پراچہ صاحب کون کون سی فلمیں دیکھ لیں ۔ لیجیے پراچہ صاحب مسکرانے لگے —— تمام فلمیں دیکھ ڈالیں ؟ تعجب کی کیا بات ہے میں نے بھی تو آخر کوئی فلم نہیں چھوڑی ۔ آج بھی ان شاء اللہ پلازا جاؤں گا ۔ کیوں بھئی پراچہ چلو گے ؟ سنا ہے بڑی اچھی پکچر لگی ہے وہاں ۔ مس نہیں کرنا چاہیے ۔ ایلو گھنٹی بج رہی ہے ۔ میر صاحب کا پیریڈ ختم ہوا کمبخت کلاس کے باہر وقت کس قدر جلد گزر جاتا ہے اب شاید ..... صاحب کا پیریڈ ہے ۔ کیوں پراچہ ٹھیک ہے نا ۔ مجھے تو ٹائم ٹیبل یاد نہیں رہتا ۔ چلو یار چلیں ..... صاحب کا پیریڈ ضرور اٹنڈ کرنا چاہیے ۔

امتحان —— ؟ ارے امتحان کی کیسی پرواہ ہے زندگی کے بڑے بڑے امتحانوں کے مقابلے میں ان امتحانوں کی کیا اہمیت ہے میں ان معمولی امتحانوں کی فکر میں گھلنا نہیں چاہتا ۔ میرا مقصد زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے ۔ اور ظاہر ہے امتحان کا تصور اس خوشی میں مخل ہے ۔ لہٰذا اس کے متعلق میں سوچتا بھی نہیں زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ میں فیل ہو جاؤں گا ۔ اچھا ہی ہوگا ۔ کالج لائف کو Enjoy کرنے کے لیے ایک سال اور مل جائے گا ۔ والد صاحب خدا کے فضل سے سلامت ہیں میں تو کالج میں صرف کالج لائف کا مزہ لوٹنے کے لیے داخل ہوا ہوں ۔ لیجیے وہ کلاس روم آ گیا ۔ مگر ذرا ٹھہریے —— لڑکے تمام پہنچ چکے ہیں اب کیا خاک کریں اٹنڈ پیریڈ ۔ اور پھر پروفیسر صاحب حاضری بھی تو لے چکے ہیں اب کل ہی پیریڈ اٹنڈ کروں گا ۔

اچھا جناب میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا میں تو اب بہت تھک گیا ہوں ۔ لہٰذا ہوسٹل جا کر سو رہوں گا ۔ شام کو پراچہ کے ساتھ پلازا بھی جانا ہے —— ہاں اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ میں واقعی —— "ایک طالب علم ہوں" ۔

قائدِ اعظم

طلبہ سے خطاب

"آپ کی بھلائی ۔ آپ کے والدین کی بھلائی بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ کی توجہات صرف تحصیلِ علم کے لیے وقف رہیں ۔ صرف اس طرح آپ خود کو کشمکشِ حیات کے لیے مسلح کر سکتے ہیں اس زندگی کے لیے جو آپ کو عنقریب پیش آنے والی ہے ۔ صرف اس طریقے سے آپ اپنی مملکت کے لیے طاقت اور فخر کا سرچشمہ بن سکتے ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں ۔ جو اس مملکت کے معاشرتی اور معاشی میدان میں درپیش ہیں ۔ صرف اس صورت میں آپ اسے دنیا کی ایک عظیم ترین طاقت ور اور ترقی یافتہ قوم بنا کر منزلِ مقصود تک پہنچا سکتے ہیں ۔"

کرامت اللہ

ایک مُشاعرہ

(طنز و مزاح)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہر دوسرے تیسرے ہفتے کوئی نہ کوئی مشاعرہ منعقد ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ مشاعرے سننے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ محبوب شعرائے کرام سے متعارف ہونے سے زیادہ ان کی شبیہ مبارک سے مستفید ہوتے اور ان کے کلام سے محظوظ ہوتے ہیں۔ لوگ زیادہ قیمتوں کے ٹکٹ خرید کر شعراء حضرات سے قربت میں کوشاں رہتے ہیں۔ شاید دور بیٹھنے والوں کے کان کی بجائے ناک میں بست عروں کا ترنم گھس جاتا ہے یا ویسے نزدیک سے ان کی رگوں کے زیر و بم کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے بہر حال ؏

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بازاروں میں قد آدم اشتہار لگا دیئے جاتے ہیں:

"آج فلاں صاحب کی زیر صدارت فلاں جگہ فلاں وقت پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے جس میں ملک کے چوٹی کے شعرائے کرام حصہ لے رہے ہیں۔

پانی اور پردے کا خاص انتظام ہوگا"

اور اس سے نیچے قدرے جلی حروف میں شعراء حضرات کے اسمائے گرامی درج ہوتے ہیں۔ جیسے تلاش گمشدگان مقصود ہو۔ میرے دل میں بھی اس پرہیبت اشتہار کو پڑھ کر گدگدی سی ہوتی اور جانے یا نہ جانے کی کشمکش میں ہی تاریخ معینہ گزر جاتی اور ارمان مچل کر رہ جاتے۔ اتنی شدید نفرت کی وجہ والدین کے رعب کے سوا کچھ نہیں۔ شام کو سات بجے کے بعد کواڑ بند کر دیئے جاتے ہیں اور مصیبت تو یہ ہے کہ بیشتر مشاعرے سات بجے رات کے بعد ہی ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ میرا امتحان نزدیک تھا۔ والدین ایک عزیز کی شادی میں شریک ہونے کے لئے تشریف لے جا چکے تھے مجھے امتحانات کی وجہ سے گھر میں رہ کر پڑھنے کی شدید تاکید کی گئی تھی، اور رمضان نوکر کو سی آئی ڈی کے طور پر مجھ پر نگران مقرر کر دیا گیا تھا۔

میں پڑھنے میں مشغول تھا کہ میرا پڑوسی اختر آ دھمکا۔ وہ میرا ہم جماعت ہونے کی وجہ سے اکثر میرے ہاں آیا کرتا ہے اس کی آمد سے میں چنداں حیران نہ ہوا۔ وہ آتے ہی برس پڑا۔ "ابے! چھوڑو ان کتابوں کو۔ چلو آج فلاں ہال میں ایک مزیدار مشاعرہ ہو رہا ہے۔ کبھی کتابی دنیا سے باہر بھی سر اٹھا کر دیکھا ہے؟" اور ایک اشتہار کی تہوں کو کھول کر میرے سامنے پھیلا دیا۔ سرخی تھی:

"آپ کے پسندیدہ شعراء آپ کے سامنے"۔

اس سرخی میں کچھ ایسی جاذبیت اور مقناطیسی قوت تھی۔ کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر ہر سطر کے پیچھے والد صاحب کا چہرہ دکھائی دیا میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "مشاعروں میں جانا اور سننا خواہ مخواہ کی دردسری ہے بابا۔ معاف رکھو ہمیں۔ رمضان نے اگر اباجی سے کہہ دیا تو کان پکڑوا دیئے جائیں گے"۔

"اٹھو یار پرویز! چھوڑو ان باتوں کو رمضان سے بھی نپٹ لیں گے"۔

اختر نے کتاب چھین کر الٹ دی۔ اور کالر سے پکڑ کر اٹھاتے

ہوئے کہا۔ "ایسے مواقع بار بار نہیں آیا کرتے۔ گھر میں کوئی بھی نہیں ہے دیر نہ کرو۔"

میں نے نصیحت کی۔ "اختر بھیا! یہ مشاعرے کام نہیں آئیں گے پڑھو گے تو پاس ہو گے ایسے مشاعرے تو ہوتے ہی رہیں گے ع ایک چھوڑو ہزار ملتے ہیں۔ فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ابے ہٹو! فائدے کے چرخے۔ خدا کی قسم اتنی مہتیاں آتی ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔" اور میرے کان میں چند ایک حوّا کی بیٹیوں کے نام گن دیئے۔ میں نے مجبوراً کتابوں پر حسرت آمیز نگاہ ڈالی اور نوکر سے "ابھی آیا" کہہ کے بادلِ ناخواستہ ڈرتے ڈرتے چل کھڑا ہوا۔

جب جائے مقررہ پر پہنچے تو دیکھا کہ میدان کاروں سائیکلوں اور پال لوگوں سے اٹا پڑا تھا۔ اتنا شور تھا کہ "الامان والحفیظ" دو تین دفعہ اختر کو جو ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ بلانے کی ضرورت پیش آئی اور اتنا چیخنا پڑا کہ گلے میں خراش ہونے لگی۔ بالآخر اسے اشاروں سے ہی مدعا کہنا پڑا۔

ایک کالی شیروانی والے صاحب اسٹیج پر بے چینی سے گھوم رہے تھے کبھی بغلی دروازے کی طرف جاتے اور واپس آجاتے۔ معلوم ہوا بے چارے منتظم ہیں اور صاحب صدر کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے منتظم صاحب کی جان میں جان آئی۔ صاحب صدر وقتِ مقررہ سے صرف تیس منٹ لیٹ تھے۔ اور اس کے باوجود ان کے چہرے پر ندامت کی بجائے غالباً ہلکے "میک اَپ" کی تہہ نظر آرہی تھی۔ منتظم صاحب نے مائیکروفون کے سامنے ناک لے جا کر لوگوں سے خاموشی کے لئے استدعا کی۔ جو کسی حد تک قبول کرلی گئی بعد ازاں انھوں نے فرمایا۔ "میں جناب ..... سے التماس کرتا ہوں کہ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر مشاعرے کا آغاز فرمادیں۔"

تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ صاحب صدر نے بتیسی نکالتے ہوئے کرسیٔ صدارت میں خود کو ٹھونس دیا۔ لوگوں نے تالی پیٹنے کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی استعمال میں لانا شروع کر دیا۔ میرے ایک قریبی نے للکارا:

"اے آمدنت باعثِ ....." اور اس طوطی کی آواز نقارخانہ میں کہیں کھو گئی۔ صاحب صدر کے ہاتھ دکھانے پر عوام اپنے کپڑوں میں واپس آگئے۔ اور مشاعرے کی کارروائی کا تلاوتِ قرآن شریف سے اقتتاح ہوا۔ منتظم صاحب نے ایک شاعر کو کلام پڑھنے کے لئے پکارا۔ شاعر نے اسٹیج پر آتے ہی تمہیدی لیکچر دینا شروع کر دیا۔ "صاحبان! پیشتر اس کے کہ میں ....."

"روؤں" ایک کونے سے صدا آئی اور تمام ہال راجا اندر کا اکھاڑہ بن گیا۔ شاعر صاحب پہلے تو بوکھلا گئے مگر جلد ہی سنبھل گئے اور زنانہ نشستوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔ "ہاں تو پیشتر اس کے کہ میں اپنا کلام آپ حضرات کے گوش گزار کروں۔ مجھے یقین محکم ہے کہ آپ اسے دلجمعی اور اطمینان قلبی سے سنیں گے اور ....."

اور اکیلے شاعر کی آواز متعدد "ضرور ضرور" کے ساتھ مل کر روشن دانوں سے باہر نکل گئی۔ خیر انھوں نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر تحریر شدہ کلام پڑھنے لگے۔

"زبانی پڑھئے" بائیں جانب سے آواز آئی۔ اور "زبانی زبانی" کی گردان کا ورد ہونے لگا۔ منتظم صاحب کو اپنی کرسی سے اچھلنا پڑا وہ لوگوں کو خاموش کروانے میں قدرے کامیاب ہو گئے۔ اور شاعر صاحب نے اپنی غزل ختم کر ڈالی۔

ایک اور شاعر کی باری آئی۔ انھوں نے چھوٹتے ہی ژالہ باری شروع کر دی۔ اور لوگوں کو شور مچانے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ ان کا کلام واقعی بہت سلجھا ہوا تھا۔

ایک صاحب کلام پڑھنے لگے تو سامعین نے "ترنم سے ترنم سے" کی رٹ لگا دی اور اتنا شور کیا کہ بے چارے شاعر کو کلام ادھورا چھوڑ کر اپنی نشست کا مرہونِ منت ہونا پڑا۔ ایک صاحب تو لوگوں کے شور و غل کے باوجود اپنا کلام پڑھتے رہے اور جب تک ختم نہ کر لیا۔ لاؤڈ سپیکر سے نہ ہٹے۔ معلوم ہوا کہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ان کا واقف ہے اور اس نے ان کے کلام کو چھاپنے کا وعدہ کیا ہے۔

ایک بڑی مونچھوں والے حضرت سٹیج پر آدھمکے اور فرمانے لگے۔ "مصرع عرض ہے: اے بھگوان! ....."

"بھگوان نہیں خدا کہو" ایک کونے سے آواز آئی۔ "کوئی

گانا ہی سنادو" ۔ ایک بولا

دوسری طرف سے آواز آئی ۔ "یہ نہیں پنجابی کلام سناؤ" جس کی تائید میں بھانت بھانت کی بولیاں گڈمڈ ہونے لگیں ۔ شاعر کو بھاگتے ہی بنی ۔

دوسرے شاعر کی باری آئی ۔ اس بیچارے کی آواز قدرے دھیمی تھی ۔ لوگوں نے کوئی دلچسپی نہ لی ۔ اور پکارنے لگے "ہم ان کا کلام ہرگز نہیں سنیں گے فلاں شاعر کو بلائیے" ۔ اور منتظم صاحب کو مجبوراً "فلاں شاعر" کو بلانا پڑا ۔ "فلاں شاعر" بھیگی بلی کی طرح اپنا کلام سنانے لگے ۔ فرمایا ؎

دیکھ کر حسن پہ پیدا دمل کا
چاند تاروں کو نہ وال آ جائے

اور ہال "واہ ۔ واہ" سے گونج اٹھا ۔ انھوں نے دوسرا مصرعہ شروع کیا تھا کہ مکرر مکرر کی فلک شگاف آوازیں بلند ہوئیں اور بے چارے کو "چھوڑ دیکھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" کا سہارا لینا پڑا ۔

ایک صاحبہ کو پکارا گیا ۔ ہال سیٹیوں ، تالیوں اور "واہ واہ" سے گونج اٹھا ۔ انھوں نے تحت اللفظ پڑھا ۔ تو ترنم سے پڑھنے کی فرمائش کی گئی ۔ اسی اثنا میں کسی نے بجلی گل کر دی ۔ اور گھپ اندھیرا چھا گیا ۔ لوگوں نے اور زیادہ شور مچانا شروع کر دیا اور ماچیں جلا جلا کر روشنی کرنے کی کوشش کی ۔ تھوڑی دیر کے بعد قمقمے روشن ہو گئے ۔ وہ صاحبہ اپنی جگہ پہ بت بنی کھڑی تھیں ۔ ایک طرف سے "جیو ۔ جیو" کی آواز آئی ۔ غرضیکہ وہ سٹیج میں دھنسی جا رہی تھیں ۔ سٹیج پہ کھڑا رہنا محال ہو گیا وہ سٹیج تو کیا ہال کو ہی چھوڑ کر بھاگ گئیں ۔ مجھے اس قبیح منظر سے نفرت سی ہو گئی ۔ اب میں وہاں سے بھاگنے کے لئے بے قرار تھا ۔ لوگ شاید دھار کھائے بیٹھے تھے ۔ کہ ہلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے ۔ میں نے اختر کو بھی اٹھانا چاہا مگر اس نے اتنی جلدی اس "مزے" کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تو میں نے اکیلے ہی دارالمحن سے جان بچائی ۔

ہمارے ملک میں بے چارے شعراء عوام کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہیں عوام شور مچا کر اپنی من مانی کر لیتے ہیں ۔ شعراء کو لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ۔ منتظمین اور صاحب صدر وغیرہ کو بھی اپنی پگڑی اچھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ میں ایسی سانحہ

(باقی صفحہ ۱ پر)

قاصد ظریف

غزل

جب شرابِ عشق سے مخمور ہو جاتا ہے دل
حاملِ اسرارِ بزمِ طور ہو جاتا ہے دل

آگہی میں رشکِ شیرازیؒ و سعدیؒ و جنیدؒ
بے خودی میں غیرتِ منصور ہو جاتا ہے دل

حسن کو بھی کچھ نہ کچھ محسوس ہوتا ہے ضرور
رازدارِ خاص جب رنجور ہو جاتا ہے دل

یاد آ جاتی ہے جب حسنِ تبسم کی بہار
اس بہارِ رنگ و بو سے دور ہو جاتا ہے دل

شب کی تنہائی میں اکثر کہکشاں کی چھاؤں میں
مختلف جذبات سے معمور ہو جاتا ہے دل

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں ! وہ عالمِ بیچارگی
اپنی منزل سے کبھی جب دور ہو جاتا ہے دل

یہ وہ نازک آبگینہ ہے کہ اے قاصد جسے
ٹھیس لگ جاتی ہے جب تو چور ہو جاتا ہے دل

محمد ذکریا طاہر

کوہِ مری

کوہ مری کے دلکش نظارے
ہر سو خدا کی قدرت عیاں ہے
پربت کے اوپر آبادیاں ہیں
جس کو بھی دیکھو شاداں و فرحاں
کوہ مری کے روشن سویرے
ہر شے پہ مُہرِ فطرت لگی ہے
ملتا ہے اس جا عیشِ فراواں
قدرت کی دیکھو مہماں نوازی

اللہ اکبر سب سے نیارے
برفوں سے اٹھتے شعلے شرارے
جو کوٹھیاں ہیں جنت نشاں ہیں
القصہ قدرت کی گلکاریاں ہیں
کالی گھٹائیں زلفیں بکھیرے
رنگینیوں کے سائے گھنیرے
ہر اک طرف سے آتے ہیں مہماں
ملتے ہیں سب کو تسکین کے ساماں

کرامت اللہ

میرزا غالب کے کلام میں شوخی و ظرافت

میرزا اسد اللہ خان غالب سے کون واقف نہیں۔ ہر مذاق اور ہر طبقہ کے لوگ ان کا کلام پڑھ کر سر دھنتے ہیں اور واہ واہ پکار اٹھتے ہیں کیونکہ آپ کے کلام میں بے حد تنوع ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری فرماتے ہیں "وید سے تمت تک مشکل سے سولہ صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو غالب کے کلام میں نہیں۔ کونسا نغمہ ہے۔ جو ان زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے" گو اکثر اشعار عشق و محبت کے نگینے سے لدے ہوئے ہیں تاہم دقیق اور پیچیدہ خیالات کے خواہش مند حضرات کے لئے نازک خیالی اور معنی آفرینی کے گوہر پارے بھی اس میں بکثرت موجود ہیں۔ اور شگفتہ طبع اصحاب کے لئے اس میں شوخی و ظرافت کا کثیر ذخیرہ بھی ہے۔ اگر انسانی فطرت کے متعلق کچھ سننا ہو تو یہاں وہ پتہ کی باتیں ہیں کہ جن کو آپ جوں جوں غور سے پڑھیں گے چشم بصیرت کھلتی جائے گی۔ اور ان کے لطف اور چاشنی میں ترقی ہوتی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر ایک اپنی ہی حالت کی عکاسی دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔ جس طرح پیانو پر انگلیاں بدلنے سے نئی نئی آوازیں نکلتی ہیں اسی طرح دیوانِ غالب کے صفحے الٹتے جائیے۔ ہر صفحے کو الٹنے سے نیا ہی لطف آئے گا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ ہر شعر دوسرے شعر پر سبقت لے جانے میں کوشاں معلوم ہوتا ہے۔ یہ تمام اشعار مرزا صاحب کے قلبی مشاہدات کی تصویریں ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ایسے اشعار لکھے ہیں۔ جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے اور اشعار اسی ذات کی صدائے بازگشت ہیں ؎

زخم بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

یہ آپ ہی کی فطرت کا خاصا تھا کہ آپ شوخیٔ طبع اور ظرافت کی وجہ سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ اس معاملے میں آپ کسی دوسرے شاعر کے مقلد نہ تھے۔ مرزا خود ساختہ اشعار میں ایسا لوچ پیدا کرتے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ وہ دوسرے شعراء کے کلام کی تقلید اپنی شایانِ شان نہ سمجھتے تھے ؎

ذرّہ بر دارِ کس چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم

حقیقت تو یہ ہے کہ خیالات کی سادگی اور زبان کی سلاست و روانی کے علاوہ یہ مرزا کی شوخیٔ طبع اور ظرافت ہی تھی۔ جس نے آپ کو مقبولیت کی منزل تک پہنچایا۔ آپ کو ظرافت اتنی بھاتی تھی کہ مرثیوں میں بھی جہاں لوگ غم و الم کا اظہار کرتے ظرافت سے کام لینے سے دریغ نہ کرتے تھے ایک ایسے ہی موقع پر مرحوم عارف سے خطاب کرتے ہوئے کہا ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے دادو ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

آپ کی ظرافت میں پاکیزگی کی جھلک تھی اور یہ شوخیٔ طبع اور ظرافت تبسم زیرِ لب تجاوز نہ کرتی تھی۔ بعض اوقات آپ اپنے اوپر بھی ہنس دیتے تھے ؎

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

نیز: غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

ایک دو جگہ تو شوخی میں حد سے گزر گئے ہیں ؎

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

ایسے ظریفانہ اشعار ان کی شوخیٔ طبع کا نتیجہ ہیں جس چبھتے ہوئے طریق پر آپ نے جنت کے عام تخیل کا مذاق اڑایا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

اور: کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ❊ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

Almanar

Talim-ul-Islam College

Magazine

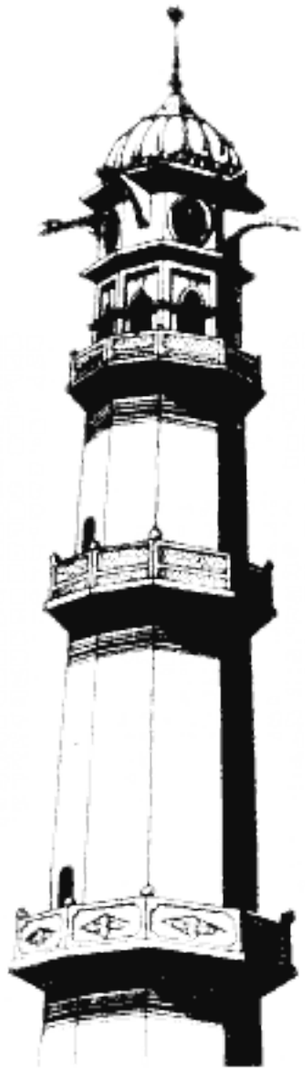

Feb. March 1953

لاإكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لاانفصام لها والله سميع عليم ـ

There should be no compulsion in religion. Surely, right has become distinct from wrong; so whosoever refuses to be led by those who transgress, and believes in Allah has surely grasped a strong handle which knows no breaking. And Allah is All-Hearing, All-Knowing.
(Al-Quran, Verse 257 : Ch. 2, pt. 3)

(Prof. Sufi Abdul Aziz, M. A.)

Our Humble Prayer

O Great God ! Let us be
Always meek and loyal to Thee,
And try in 'word' and 'deed' and 'thought'
To serve and please Thee, as we ought.

O Great God ! We all depend
Upon Thy care that seeth no end,
And only wish to do and be
Whatever seem'th good to Thee.

O Great God ! And when, at last,
All our days on earth are past,
We all implore Thee to 'ssume us above
Unto Thy bosom and Thy love.

بسم الله الرحمن الرحيم

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

Feb.-March 1953

★

Staff-Editor
Prof. Akh. M. Abdul Qadir, M. A.

Student Editor
Nur-ud-Din Ahmad
Hamid Ahmad

★

CONTENTS

Vol. 3 No. 3

1.	Editorial—Education & War	N D. Ahmad	2
2.	Ugliness is a Blessing	A. U. Khan	4
3.	Iron Rod of Science	S. Jalal Ahmad	6
4.	The Last Stand	Kunwar Idrees	9
5.	Rest And Relaxation	Ijazur Rahman	11
6.	The Chase	Hameed Ahmad	12
7.	Nothingness	Ejazun Nabi	15
8.	An Apologia	Editor	16

Printed at the Dastkari Press, Lahore and Published by A. R. Junaid for the T. I. College, Lahore

Editorial

Education & War

(N.D. AHMAD)

Why do we acquire education ? It is a qustion that is of vital importance for the people, One view is that it is a means for the broadening of outlook, cultivating better social relations and of course all the more for the general benefit of the human beings. We feel it to be an essntial activity of any society. If it is neglected or ill conducted, the values and hopes and, indeed, the very life, of the social group are in danger of being destroyed. Through a long and continuous struggle man has achieved a measure of mastery over his environments by learning how to control the forces of the physical and mental world. Education, therefore, may be regarded as most nesessary for the progress, up-keep and dignity of a nation and any nation bereft of it can no longer keep alive. In the domain of science it has made tremendous progress for the benefit and prosperity of humanity. Almost all our business now is bound up with science. The development of chemical industries or of electrical engineering or of the means of intercommunication and transport or of the use of so many other things we owe to science. In fact, thereis no limit to the possibilities of scientific achievements. It has done much to increase the human comfort. Aeroplanes, steamships, railway trains and motor cars have made it possible for us to travel from one place to another. In the field of electricity and medicine we find still greater micacles wrought. Cinema, photography, the printing press, artificial irrigation and destruction of poisnous insects have only been possible through the knowledge of science.

Coming to the dark aspect, we find that it is employed for the massacre of the people, wiping out whole nations from the globe and for a total annihilation of culture and destruction of civilization. It would be better if we quote some examples to elucidate this concept further. The official report of the U. S. Bombing Survey says that the mortality rate per square mile destroyed at Hiroshima was 15,000 and at Nagasaki 20,000 and after discussing death by "flash-burns" ("radiant heat of incredible temperatures that struck its victims with the speed of light") remarks

that the other victims were bombarded with visible and invisible rays. Dr. Langumier has warned the people : that until the release of Nuclear energy is controlled by the world, it my make the entire earth uninhabitable, wiping out the ignoble race of man." Statistics reveal that before 1900 about 25% of all battle casualties died, but in the world war I this increased to 33½%. Out of every thousand Europeans alive in the 12th century, it is thought that two died as battle casualties, but in the first 25 years of the 20th century, 54 out of every thousand so died, thus making a positive increase by 27times. It is now-a-days a common belief that any future war (a vivid and yet flesh-harrowing picture of such a one, as conceived and drawn by our Staff-Editor, has already figured in the editorial of our last issue) is bound to be more dreadful than the wars of the past, and what is most likely it may mean the end of certain civilizations. The latest destroyers of humanity, the torpedo, the submarine, the aeroplane, the tank, gas, the rocket and the A-bomb are the products of highly educated and at least highly trained personnel. It suggests that modern warfare is increasingly a function of education and education is increasingly dominated by war. It is becoming more and more involved as the warfare develops. A weekly wrote about Princeton University, in the U. S., that every day Princeton became less an academic college and more a school of war. Dr. Kolbe, an educational historian, describes the world war I, in a broad sense, as "a College man'swar".

Naturally the question arises : is this education that is responsible for the wholesale massacre and butchery of the human beings or the black heart of man which is at fault ? Education has as one of its principal aims the assisting of man's higher self to battle against the lower self. Education is, therefore, a worldwide problem and we have to reshape it on those lines so as to avoid the fatal errors of the past. We need an educational programme that will face the confounding present with vision, courage and interest. Science and technology are not and have not been the engines of destruction only, on the contrary they may yet turn out to be the meens of our salvation. New instruments of communications offer at least the hope of a more rational intercourse between nations. Uranium can positively replace coal as a power source.

In the end we should say that the profound distrust of personal relationship should now end. And, perhaps, the most tremendous task before higher education is to seek out means of restoring among nations

that calm and confident relationship which our present culture has lost, is losing and will continue to lose until positive and yet energetic measures are taken. What are those measures? We leave it to the judgement of our readers.

And finally our plea is that if humanity is to survive, it must seek and strive for something that will root out this canker, heal its bruised spirit, and make it whole.

A. U. Knan IV Year

Uglyness Is a Blessing

Ugliness is a blessing as Ignorance is a bliss at times. The only trouble with it is that it is a mixed blessing. But let not my readers conceive the idea that beauty as against ugliness is all blessing. Let us survey the pros and cons of this heading and then decide whether ugliness is more of a blessing or otherwise.

Speaking on a lower plane, we find that handsome people often feel embarrassed, when they find themselves the centre of attraction. Moreover, even people with average good looks, once appreciated by mistake, would move heaven and earth to look more and more attractive. They begin to give themselves airs and think they are the 'paragons of beauty'. They are much more worried about their appearance than an ugly man. They waste time in decorating themselves. You can just imagine the colossal waste of time and expenditure incurred by our youngmen and women in this unpaying profession. How much national time and income (in the way of foreign exchange,) which we spend on cosmetics we can save if we have more ugly people than handsome ones. It is true that "a thing of beauty is a joy for ever", but only for spectators and not for the man and woman herself. It is a matter of common experience that a comely youth feels mortified when he finds a competitor in the field, As compared with a girl, for instance, who is worried for her appearance, an ugly girl is self-satisfied. She is much more at ease than the attractive one, because she knows exactly where she stands. I have no statistics at hand, but the general educationl record shows that an ugly boy or a girl is far more hardworking and brilliant than a beautiful one, for the reason that the former is not obssessed with his or her beauty. In our college, we have got such living examples. We need not go far. The writer himself stands in a high obligation to the virtues of ugliness, and suffers from no sense of inferiority. It is admitted on all

hands that beauty is skin deep and that, too, declines with the passage of time. In reality, handsome is that handsome does. The outward beauty of a China vase is of no use if it be tenanted by spiders and snakes inside. It is the intrinsic values and qualities of a man which count. An ugly man being devoid of misconception about himself is in a far better position to utilise his time in constructive work than the other category that sacrifices all future to the lure of 'the fair moment'. Let us take into consideration another aspect of ugliness. Whereas beauty wants appreciation, ugliness does not care for it. Have you ever heard of contests in this respect? One can easily guess the amount of national savings (in way of time and money) again. Whereas a beautiful man, through sheer lack of appreciation, may be depressed, an-uglyman has no reason to be so. He carries on his normal work and outshines his rivals in other qualities. This is the reason why we find that the most hardworking and practical men came from people with scarcely moderate and hardly tolerable looks. Just have a look at President Eisenhower, Mr. Churchill, Gen. Negiub, Kh. Nazim-ud-Din and Dr. Omar Hayat Malik. Take nations for example, the Chinese are far more plodding and industrious, than the Englishmen. Ugly men, as a rule have got sharp practical commonsense about them. They have proved far better administrators, soldiers, and statesmen and have always withstood the charm of sybils. The reason is not far to seek. They are impervious to flattery and immune from that temptation of all temptations, the woman. A man obsessed with the idea of his good looks cares more for public opinion than an ugly man does. They are more matter-of-fact and responsible. Psychologically speaking, men possessing physical charms tend to be obdurate, froward, and irresponsible. My beautiful friends must disabuse their minds of the idea that ugly men are often the victims of inferiority complex. This is a sweeping indictment. The uglymen made up in hardwork what they lacked in looks, because their existence depended upon diligence. In fact, ugliness has its own charm provided the man blessed with it possesses some sterling qualities of character. Among the immortals of both literature and science, an overwhelming majority is of those whose ugliness of face beams with the light of wisdom, whose handwriting extremely irregular and inconsistent, a veritable opprobrium in the realm of calligraphy. reveals the beauty of thought and language.

It is true that this is an age full of aesthetic sense. What is the reason

of its being so, after all? Ugliness is the root cause of that. In fact, this science, aesthetics, stands in a high obligation to ugliness, nay owes its very being to it. Even the so called beauty cannot appear more beautiful without the help of ugliness, which sets it off well. The green paper serves as a foil to gold, the thorn to the flower, and the dark night to the garish day. Perhaps, in the harems, at Courts, in palaces, black men, negroes, etc, were kept and are still kept, as history proves it, to set off, by the odious contrast, the white beauty of prince and princess. The mansions of the rich would not look more beautiful without the slums of the poor. Perhaps, this is the reason why the aristrocracy and the high in power, gifted with a 'noble' aesthetic sense, never turn their attention to them and leave them to their 'self government', to live and die in 'ugly peace'.

Again, speaking on a cosmopolitan plane, sex is the source of all struggles. Even wars are originated by this. How peaceful this world would have been, if only ugly people had inhabited it, because beauty is a great stimulant to sex-it provoketh thieves more than gold. Had Cleopetra a shorter nose, the Roman Empire would not have fallen. Had Helen been born with a plain face, her 'cheeks' would not have launched those 'thousand ships' which set aflame the towers of Ilium. This is true of so many noses and faces in Pakistan. Would, that our country had more ugly people! We want hardworking and patriotic people and ugliness is the answer. So why not call it a full fledged blessing?

S. Jalal Ahmad Khan IV Year

The Iron Rod of Scitence Or The Magic Wand of Literature

The magic wand of literature every time! If I were to have my way the world would still be romantic, gallant and true. There would be none of the hurry and bustle, none of the cruelty and exploitation, none of the sordidness and filth of this world. I would still have ideals and faith in those ideals-ideals of beauty, truth and goodness, ideals of hellenistic glory and not ideals of the atomic bomb

and ugly skyscrapers. I would have the faery worlds of Shakespeare, of Wordsworth, of Keats, and not the garish, humdrum, exasperating world of today. I would have my world peopled along with men by the beautiful gods of ancient Greece, by the dragons and giants of the medeival ages. Science, it is said, has opened new vistas for the adventurous. New vistas, indeed, for old ones, new vistas of black coal-pits and of unending factories, sordid and mundane, new vistas of earth where there were vistas of heaven, new vistas of filth where there were vistas of beauty. True, science has enlarged the material world but what of the world of fancy and imagination ? "Where is the man with soul so dead" that would find the world of today more fascinating than the world of Greek mythology ?

Science gives me a feeling of insecurity, of doubt, of uneasiness. Passing foolish must, indeed, be the man who claims that science is true. How many theories which were but yesterday accepted as infallible have we not seen exploded ? And who can doubt that the scienrific truths of today will tomorrow be proved wrong and baseless ?

Great as the material benefits of science are, greater by far is its curse. War is one of the main aspects of human nature. To use a scientific phrase, life consists in the "survival of the fittest". Man was made to fight and strive. And one has but to compare the wars of old with the wars ot todayto bring home to the votaries of science onlv one phase of the horrors that science has bequeathed to suffering humanity. The wars of old with all their toil and trouble, all their pain and travail had still facets which were sublime in their glory and matchless in their splendour. They were cruel, no doubt, but cruel without being morbid ; terrible and ghastly at times but never the carnage and slaughter that they are today. The sword and the lance symbolized those wars, and thanks to science, the atomic bomb symbolizes the war of today. Doubtless, science keeps thousands alive, who who would have perished without its aid. But it keeps them alive to be sacrificed at the blazing altar of the atomic bomb.

The hectic progress of science seems to have outrun the moral and spiritual consciousness of man. Whatever we may say, our ideas still bear the stamp of the past ; it is the physical world that has changed. There is an uneasiness in the world born of the inconsistency between our spiritual and physical worlds. Mankind is flustered and out of breath in trying to catch up with

the headlong onward rush of science.

Amongst the greatest of the curses of the application of theoretical science is Industrialism. It has struck at the very roots of the dignity of human life. The individual is no longer a human being, he is an automaton, a part of machinery to be treated as such and discarded when useless. Of industrializaton is born the spiritual and moral curse of communism. Communism does to the soul of man what industrialism coupled with exploitation has done to his body. What is more, that except in theory, communism does nothing to ameliorate the physical condition of man. In truth it makes it worse. The greatest immorality of communism lies in the fact that under it man ceases to be man, he is reduced to a nonentity, to a mere cipher in every aspect of his life.

Literature is democratic in essence and spirit, whereas science lends itself to the formation of classes in society-classes more esoteric and exclusive than the aristocracy of the feudal times. Literature caters to the taste of the high and low alike, all may come to its spring and drink long and deep. Literature to be successful and great, with very few exceptions, must appeal to the generality of mankind. Science has no such fraternal bonds, it tends to create water-tight compartments in the social world.

Would! that mankind could realize and apprehend the doom and destruction it is heading for. It is in literature and in all things artistic that the hope and salvation of man lies. When Einstien has been proved wrong, when the physics of today is shown to be nothing but superstition, when other theories of nuclear science are propounded, in their own turn to be refuted, then Shakespeare shall still be sublime, Milton shall still be grand, Keats shall still be beautiful--literature shall still be true.

When all the then known horrors of science, its engines of destruction and butchery, the shot and shell and shrapnel were plying their gory trade on the fields of Waterloo, when it was touch and go with the armies of the Iron Duke, when Napoleon had all but carried the day which might have changed the complexion of the world to come. then it was the heroic language of Shakespear's Henry V which inspired the hard-pressed soldiers of England to feats of courage and endurance unsurpassed in the annals of military history. As the Imperial Guard charged and the English regiments formed squares in the final phase of the great battle, the pink-faced English lads "whose limbs were made in England" were chanting

the powerful lines describing the battle of Agincourt.

Literature is to science what the soul of man is to the Atom Bomb, what the magician's wand is to an iron rod however massive. It is because literature finds inspiration in human life and human destinies. Its substance is based upon the magic of the stars and the moon, upon the splendour of the rising sun, upon the blinding flash of lightning, upon the clouds of ominous black, upon the roar of cataracts and not upon "two and too make four."

Yes, the magic wand of literature every time in preference to the iron rod of science, a life of imagery to a life of squalor, a world of fanciful dreams to a world of mundane reality and the "cloudy symbols of a high romance" to the orange clouds over Hiroshima and Nagasaki.

Kunwar Idrees III Year

The Last Stand

India was passing through the darkest hours of its history. The aggressive forces of Britain were dominating the political and economic life of the country. Native rulers and princes were completely overpowered and their sovereignty was reduced to a sham. The Mughal Monarch at Delhi was leading the life of a titular head of the once great empire, amid the ruins of its ancient grandeur. The Englishmen were enjoying a countrywide supremacy.

At that time the English found their formidable foe in Tipu Sultan. Tipu was the cynosure of his sujbects and his growing popularity and strength were a source of constant alarm and danger to the English.

Unlike his contemporary rulers he refused to submit to the English and did not allow his soil to nourish the ruthless forces of aggressive imperialism. Britain and the other native powers entered into an alliance against him and Tipu was completely isolated. He sought the help of the French to free India of the yoke of Britain. He sent envoys to France and Constantinople, but they returned with no material help. The French government itself was facing economic and political crisis and, therefore, they expressed their inability to lend to Tipu any active help. Ali his ambitions and plans proved futile. Had he been successful in his noble mission the phase of Indian history would have been completely different from what it is now.

In the year 1790, the English took the initiative and Cornwallis, the then Governor General of India, himself assumed the command of

operations against Tipu Sultan. The formidable triple alliance of the Marhattas, the Nizam and the English was strong for him. He foiled the repeated aggressive designs of his enemies and tried his skill and diplomacy to avert disaster. In 1792 he was forced to surrender the half of his dominions and his sons as hostages.

This terrible defeat inflicted upon him by his countrymen and foreigners, co-religionists and infidles practically crippled him. Even in this sorrowful state of affairs he didnot give up hope and continued his strenous efforts to regain his lost territory and prestige.

Hostilities were resumed in 1799, when his kingdom was invaded on all sides. Dejected and frustrated, Tipu made the last desparate attempt to root out the evil of imperialism from India. But the Almighty willed otherwise, and he was defeated at Sedaseer and then again at Malvelly and he retired within the walls of his metropolis which was besieged and he fell down fighting on the outskirts of Seringapattam, indiscriminately among the common soldiers.

Tipu Sultan was a great ruler and a soldier. In him his countrymen found a wonderful union of martial and intellectual abilities. But he was hit by a persistent spell of illluck. He could not make others realize the devastation which was to await India in the following years of slavery and repression. According to Shakespeare;—

"Evil that men do lives after them,
The good is oft interred with
their bones."

Exactly the same treatment has been accorded by the modern and European contemporary writers. Out of their jealousies against this great prince, they simply distorted the facts. Minute infirmities in his character were greatly magnified. Yet many Europeans have expressed favourable views about his character and administration. An impartial observer Dirom wrote: "Discipline and fidelity of his troops in the field, until their last overthrow were testimonies equally strong of the excellent regulation which existed in his army. His government, though strict and arbitrary, was the despotism of a politic and able sovereign." Sir John Shore wrote: "The peasantry of his dominions are protected and their labours encouraged and rewarded."

In fact Tipu Sultan was a great man, with a spotless character, above religious intolerance and was not addicted to the common vices of his class. He was deeply impressed by the truth of his religion and respected other communities.

On a critical occasion, he said, "I solely rely on Providence, expectin that I shall be alone, unsupported,

but God and my courage will accomplish everything."

Tipu Sultan is, undoubtedly, a great figure in the Indian history. The annals of Muslim India may record the names of abler generals and more far-sighted statesmen than Tipu but certainly of not a more sincere patriot than he. He preferred the death of a lion to living an ignominious life of a thief.

His death was as honourable as his life had been useful. With his death sounded the death-knell of the Muslim rule in India. The old Hindu dynasty was restored under the nominal headship of an impotent prince. The name of Tipu Sultan is revered by all patriots and lovers of freedom. So far as India retains any recollection of its history the name of Tipu Sultan will be remembered with honour and gratitude.

Macaulay says, "A people which takes no pride in the noble achievements of remote oncestors will never achieve anything worthy to be remebered with pride by remote decendants."

Though Tipu failed in his mission, yet we admire and honour him for his patriotism, self-less devotion to his subjects, and by reason of sacrificing his life in the cause of freedom he is worthy of all praise and we must be proud of him.

Ijazur Rahman IV Year

Rest and Relaxation

The human body is so constructed that every organ has a period of activity, and a period of rest and relaxation. It is positively necessary and imperative that this rule of nature be carefully observed.

The heart, for instance, takes a period of rest after each contraction or beat. It demands its rest and takes it, and the individual has no power to limit or control its action. On the other hand the stomach which, also, needs regulated rest periods is unfortunately under one's complete control. The stomach aches, and sometimes serious consequences result from disregarding the rules of the stomach's rest. The kidneys, too, need regular rest periods and plenty of water to wash away the waste they take care of. One very excellent way to rest the kidneys is to have one day a week when only light food is taken, principally fruit juices, milk and water. In this way one will give them rest and tonic that may efface all traces of disease of these organs.

Our eyes, also, have need for much rest from seeing and focussing. They actually grow old. So protect your eyes that they may last long and do

you good service. There is no sense so useful and aesthetic as the sense of light,

Many persons are unable to take a holiday from all work and employment ; and many of us that have a holiday do not enjoy real rest and relaxation, because we are as active and unsettled during that period as during the usual daily routine.

You can have your vacation and rest daily by giving yourself ten minutes out of every day. Recline prone on a firm comfortable bed, the shoulders slightly raised, the head at a very slight elevation, and the legs and arms extended at a comfortable angle. For a few seconds, contract every muscle of the body over which you have control, and at the same time inhale deeply, then exhale and relax all the muscles and continue breathing normally for ten minutes. Close the eyes gently to relax them and keep out all sight or stimulation. It is well lightly to place a pledget of cotton in each ear to relax the anditory nerve and shut out all sounds, thus relaxing the brain as well Do not even think. Do not even speak a word.

It may be necessary to practise this routine several times before you are able to relax completely, but when perfected you will be astounded at the real value you receive from this simple daily custom.

Ha meed Ahmad IV Year

The Chase

Towards the end of the year 1947, in the whole Valley of Kashmir and Jammu State, there was great resentment and stir against the Dogra Raja who had announced his decision of joining the state to the Indian Union. The people did not like that idea at all. In the western parts of the State, the people, therefore, revolted, challenging the very authority of the Dogra Rule and consequently they achieved a little success in that direction by their continuous struggle. But in the southern parts, the Kashmiri Muslims were in a critical, rather dangerous situation, as the influx of non-Muslims from the adjoining districts of the West Punjab made matters worse. So-they were either forced to leave the land and migrate to the newly established Muslim State, Pakistan, or being tortured in several ways and killed mercilessly, to slake their thirst for revenge, by the so called Dogras who were armed already for the bloody purpose.

Under such awful circumstances, a poor Muslim Gujar family of nearly two dozen persons, including yo-

ung and old men and women with their children, was making good their escape, at dead of might,under cover of darkness, with their hearts sad and gloomy and eyes full of tears. All they could carry with them were a few bags containing articles of dress a quantity of rice and some necessary utensils to cook food in and three "huqqas" which were, perhaps, the most valuable things to them. At a quick pace they were psoceeditg on to the broders, walking along a narrw track through the thick jungles and the hilly regions. They went on and on. When the day was about to dawn they had just completed a part of their journey, that is, the mountainous track had come to an end. The plains extenied before them and the border was within the beat of a few miles. Then they had to cross a stream that lay in the way. Its cold water used to be crystal-clear but that day it was somewhat muddy and impure and was flowing fast due to the recent rains. Crossing the stream was a problem then. There was no bridge across it. The two stony and rocky banks were covered with green bushes and wild herbs growing in abundance. The luxuriant verdure and the chirping of the birds at day-break had no attraction whatsoever for those emigrants who were pre-occupied with only one idea, that is, to reach Pakistan safely, but Nature was not so kind to them as they had expected her to be.

In the meanwhile a gang of Dogras armed with modern ammunition came to know of their escape and determiued to chase, loot and finally kill them. It started on its plundering tour. At dawn it overtook its prey near that stream.

The poor and unfortunate Muslims seemed to be reluctant to cross the stream partly because they were weary and tired and so wanted some light rest and partly because they had to carry across with them seven small children, both males and females, who were quite at a loss to understand the perilous situation they were in and three of them were too young to walk. "Hark! There is firing", shouted one of the elderly persons. All were alarmed and harassed greatly to hear the loud rsport of a rifle, They saw an armed gang coming down the nearest hill, with its roaring guns. They must cross the stream immediately or perish there. Suddenly one of them, by a shot from the enemy. was wounded seriously and another received slight injuries. Without any further loss of time, almost every member of the wretched family jumped into the stream leaving all their belongings in haste. Even the babies were deserted as if they were no blood of theirs. One stout brave

young man of twenty-two remained out of water still taking care of the young ones. He determined to save them all but he was in a fix and did not knew how to accomplish that. The uniformed gang approached near. Courageous as he was, he could not hit upon any plan better than to hastily spread his course sheet of cloth on the ground, put the babies on it, bind them up into a bundle and to carry it accross the stream.

In no time he was in water with the living parcel held and supported on his breast, with a grip firm on the knot. Though around and behind hin was a shower of bullets from the guns of the enemy, yet he splashed and pushd on. All the rest had almost reachedthe other bank, drenched to theskin and shivering with cold when the heroic young man was just in the middle of the stream. Luckily for him no bullet struck him and he was safely struggling in water, but lo! the daring strategem failed and the bold undertaking came to naught. What? The knot relaxed and gaveway and thus the bundle opened, The small babes along with the sheet fell into the water. Their shrieks and cries! Amidst cries they struggled and strove to catch at a straw. but in vain. One child, firmly grasping the cloth with its tiny hands plunged and bobbed up a few times and then appeared no more "Ah! what to be done now"? he asked himself helplessly when he saw the gang drawing very near. So he could not stay in water any longer to save even one.

After a small interval, the ruffled waters grew calm again. The only signs indicative of their watery grave were the bubbles that rose on the surface, Those bubbles, also, couldn't withstand the loss of the tiny souls and they brust with grief.

To the disappointment and grief of all, who wated for his safety with held breath and in agonising suspense, a most melancholy and dismal figure-emerged from the stream. What a loss to their parents! One mother fainted on the spot on hearing the new sand another lost balance, while the plight of others was most pitiable and touching.

The next morning their dead bodies were found floating along the banks on the surface of the running water. This was what remained of the little innocent creatures!

EJAZUN NABI, B. A.

Nothingness

1. It is written on the stars,
And on everything temporal,
That all that lives,
Doth move, at last, to nothingness.

2. The pace and the tempo,
Of the march to nothingness,
Varies from object to object,
And from life to life.

3. Some rush towards the end,
Some linger towards the end,
Some wax like the melting taper,
Some perish like a falling star.

4. Heart bleeds when we think, O'Lord,
That Death, the daughter of darkness,
Is our inevitable doom,
Our inescapable gruesome destiny.

5. It torments the soul to conjecture,
That death will come at last,
To all that is beauty and loveliness,
To all that is light and life.

6. What a dreadful doom it is,
That whole humanity will be blown away,
Like a heap of dead leaves,
By the storm of death.

7. But the real death,
Is not the death of flesh and limb,
But of memory,
In the minds of men we prize,
And in the hearts of people we adore.

8. It is not how we live that matters,

It is what we leave behind that matters,
A respect or a regret,
To be mingled with our memory.

9. Though I may be no more and die like others,
Still I wish to live among the living,
This much I want, O,God,
A name to live and not a name to perish.

★

An Apologia

We regret we are not having any article from our Staff-Editor, Prof. M. Abdul Qadir, in this Issue. We realise that our readers will feel this shortage. Either we should give a practical shape to Prof. B.'s suggestion or increase the pages of the Magaznie. Either of the two can lend impetus Incharge, Editorial Staff (Eng. Sec.) whose democratic sense seems too fastidious to admit of "a further usurpation of the limited space at our disposal" as he puts and construes it. However, we assure the readers that in the next issue they will get some food for thought.

(Ed.)